علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

تندیِ صہبا سے آبگینے کو پگھلتے دیکھا ہے آپ نے؟ ہم نے دیکھا ہے! دل کے خون سے لکھی گئی تحریروں میں!! وہ ادیب گر تھے، باقاعدہ ادیبوں میں کبھی شمار نہیں ہوا ذاکر صاحب کا۔ مگر، صاحب، دیکھیئے تو، کس غضب کا قلم ہے؛ اور جذبۂ بے اختیارِ شوق کا وہ عالم کہ ہلکی آنچ بھی لَو دے اٹھے!

دل کے خون سے لکھی ہوئی تحریریں

از: ڈاکٹر ذاکر حسین

میں سمجھتا ہوں کہ، مسلمانانِ ہند کا مقام، ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے ۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں، کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیر اقتدار آزادی سے محروم، مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے ہیں ! یہاں کی آبادی مختلف مذاہب، مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے! اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہئے مسلمانوں کی وہی ہندستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے سے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال، اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے، اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہم وطنوں کے دل میں ان کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو۔

●

آپ مجھے معاف فرمائیں اگر ودّیا پیٹھ کے اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اِس میں جہاں شخصی خودغرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کا دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے ۔ اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس بات پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرو اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان، ہندوستان میں اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات، اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندستانی قوم کے ساتھ بھی خیانت سمجھتے ہیں ۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندستان میں ان کا دین، ملک سے بےتعلّقی کا عذر نہ ہو، بلکہ خدمت کی ذمّہ داری پر ڈالے، اور وہ ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔

(کاشی ودّیا پیٹھ کا کانووکیشن ایڈریس)

●

خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھارئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے، کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سِسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو، کوئی ایک سیاسی حماقت کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں! اس میں بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور، اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جس میں بھائی بھائی یکدل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

●

ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے دائرے تھے لیکن ایک مشترکہ قطعہ بھی تھا جو اُس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج بھی یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا۔ ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہو جائے۔

میرا یہ خیال ہے کہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا۔ تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں۔ انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے۔ اس میں سے تہذیب کے چند ہزار سال نکال دیجئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا تھا؛ اس لیے آج ان افراد اور قوموں میں جنھیں ہم مہذب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانے کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی ہیں جو موقع ملنے پر ابھر آتی ہیں۔ دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں،

آپس میں لڑتی نہیں بلکہ گلے ملتی ہیں اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں۔ مگر جب ان کی وحشتیں ان کی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں تو ایک تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کا منہ نوچنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں۔

آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیے چھوڑ دیجئے، آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندستان کو ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں وہ ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے۔

●

آدمی کو آدمی کا بھائی قدرت بناتی ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ایک دیس میں پیدا کیا ہے۔ اسی مٹی سے ہم سب بنے ہیں، اسی کی مٹی میں ہم سب ملتے رہے ہیں، اسی میں پلے بڑھے ہیں اور اسی میں مرتے، جلتے، گڑتے ہیں۔ اس کے تاروں سے سرگوشیاں کرنے والے پہاڑوں کی طاقت اور مضبوطی، اس کے میدانوں کو موت کے بعد زندگی بخشنے والے دریاؤں کا فیض رساں بہاؤ، اس کے جنگلوں کی عارفانہ دم کشی، اس کی چڑیوں کی چہک، اس کے پھولوں کی مہک، یہ سب تم جانو کہ نہ جانو، ہمارے تمہارے سب کے رونگٹے رونگٹے میں بسے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم نے سب نے اس کے ہر آرام اور اس کے ہر دُکھ میں ایک حصہ پایا ہے۔ اس کی نسیم نے سب سے یک سی اٹھکھیلیاں کی ہیں، اور اس کی لُو نے ہم سب کو ایک سا جھلسایا ہے۔ اس کی زمین نے جو اُگلا ہے اس سے ہم سب نے پیٹ پالا ہے اور اس کے کالوں اور قحطوں نے ہم سے کبھی نہیں پوچھا کہ ہندو ہو مسلمان ہو یا سکھ؟ اس کے جانوروں نے تمہاری ہماری سب کی مدد کی ہے اور ہاں، اس کے سانپوں نے تم کو ہم کو، ہاں تم کو اور ہم کو، یکساں ڈسا ہے اور تم کو ہم کو یکساں فائدہ پہنچایا ہے، قدرت نے جو رشتہ جوڑا ہے اسے توڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟

ہم کو تم کو قدرت نے ہی ایک دیس میں پیدا کر کے بھائی نہیں بنایا ہے بلکہ ہم اپنی خوشی سے مل جل کر صدیوں ساتھ رہے ہیں۔ غم و شادی میں ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں، آپس میں سلوک کئے ہیں، ایک دوسرے کے عیبوں سے چشم پوشی کی ہے، ہنر ڈھونڈے ہیں، سیکھے ہیں، سکھائے ہیں، ایک نے اپنی کمی دوسرے سے پوری کی ہے، ایک دوسرے کو برتا ہے، پرکھا ہے، سمجھا ہے، محبت کی ہے، وفاداری کی سب رسمیں نباہی ہیں، ایک دوسرے کے جان و دل میں دخیل رہے ہیں، غلامی کی اندھیری رات کو اسی ٹمٹاتے دئیے کے سہارے کاٹ کر سحر کی ہے۔ آزادی کا سورج نکلتے ہی کیوں پلٹے جارہے ہیں، کیوں نگاہیں بدلی جاتی ہیں۔ دوستو، دوستی کی رسمیں نباہو، دوستوں کو دشمن نہ جانو، کسی عارضی جنون میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو۔ مجنونوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے۔ دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو، دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہ اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ محبت، بھروسہ اور یقین سے کام لو اور صدیوں کی غلامی کے بعد، ایسی غلامی کے بعد جس میں ہم اپنا الّو سیدھا کرنے کی خاطر مذہبی تعصّبات کو بے روک ٹوک اکسانے اور بھائی کو بھائی کے، اور دوست کو دوست کے خلاف کھڑا کر دینے کا ڈھنگ سیکھ گئے تھے، جس نے ہمیں ٹکڑیوں میں بانٹ کر ہماری قومی زندگی کو تتّر بتّر کر دیا تھا، وہ غلامی قانوناً ختم ہوئی ہے۔ قانوناً۔ عملاً تو وہ اس وقت ختم ہوگی جب ہم تم سب مل کر، اپنے اپنے اکیلے سے، اپنی سوجھ بوجھ سے، اپنی محنت سے، اپنی محبت سے، مخلصانہ خدمت سے، ان سارے روگوں کو دور کر دیں گے جو غلامی نے ہم میں پیدا کر دئے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سن کر تم میں سے بہتوں کے دل میں کیا خیال آئیگا۔ ہزاروں بار اسے سن چکا ہوں، روز سیکڑوں بار سنتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہم مجنون نہیں ہیں، مجنون کوئی اور ہے، ہم جنون کا بدلہ لے رہے ہیں۔ ہاں اگر تم بدلہ بھی لے رہے ہو تو جنون کا بدلہ جنون سے لے رہے ہو، اور یہ خود جنون کی علامت ہے۔ بدنصیب ہے، بدنصیب، وہ آدمی، اور بدبخت ہے، بدبخت ہے، وہ قوم جو اپنے پُن کی ترازو کسی اور کے پاپ کو بنائے، جو کسی اور کی بداعمالی کو اپنے عمل کا معیار قرار دے۔ برائی کی نقل کرنے سے کبھی اچھائی پیدا نہیں ہوئی ہے، گناہ کی پیروی کر کے کوئی ثواب کی منزل تک نہیں پہنچا ہے۔ اپنے اپنے سینہ پر ہاتھ دھرو اور سوچو، اپنے ضمیر کی آواز پر دھیان دو تو تم کو پتہ ملے گا کہ گناہ ہم سب نے کیا ہے۔ جی بھر کر گناہ، جی بھر کر ظلم۔ ہم میں سے کسی کو شرم سے آنکھ اٹھانے کا یارا نہیں۔ گناہ کے پیالے کی تلچھٹ تک ہم سب نے چاٹ ڈالی ہے۔ تب ہی تو سب کے غم کا پیمانہ بھی لبریز ہے۔ اس غم کو غصہ میں نہ بدلو۔ شرماؤ۔ شرماؤ اور توبہ کرو، سب کے سب، شرماؤ توبہ کرو۔ ایک دوسرے پر الزام لگا کر، دوسرے کے گناہ کو اچھال کر اور اپنے کو دبا کر، یہ نہ سمجھو کہ تم اپنے ضمیر کی آواز کو ہمیشہ کے لئے چپ کر سکتے ہو۔ وہ تمہیں برابر ستائے گی، وہ تمھاری نیندیں حرام کر دے گی۔ اور جس نے اسے دبا کر چپ کر دیا وہ تو سخت ہی بدنصیب ہے۔ وہ انسانیت کے درجہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتا ہے، جانوروں کو بھی اسے اپنے زمرہ میں لینے سے عار ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی قوم کی قوم ایسا کرتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے مہذب قوموں کی صف سے اپنے کو نکالے جانے کا حقدار بناتی ہے۔ اپنی انسانیت کو بچاؤ، اپنی قوم کے مہذب زندگی کے حق کو تلف نہ ہونے دو۔ تہذیب اور انسانیت اور شرافت کی وہ ساری پونجی جو ہم نے غلامی کی گھٹا ٹوپ رات میں نفاق کی آگوں سے، خود غرضی کے طوفانوں سے بچا کر نکالی تھی اسے آزادی کی پو پھٹتے وقت خاک میں ملاتے ہو؟ ایسا نہ کرو۔ اسے بچاؤ اور تہیّہ کرو کہ اپنی زندگی کو اس پیارے کام میں کھپا دو گے جس کی ذمہ داری آزادی نے تمہارے کاندھوں پر رکھی ہے۔ اور یاد رہے کہ اس کام کو نفرت کی گندگی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور دلوں سے کبھی انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے محبت کی، بھروسہ اور یقین کی!

●

مسلمان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی بھی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ مسلمان ہونے کے معنی ہیں ذہنی زندگی کا ایک مطمحِ نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے کچھ معیار تسلیم کرنا، پست و بلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا، صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصور ذہن میں رکھنا۔ اور یہ سب محض ذہنی اور فکری تسکین اور توازن کے لئے نہیں بلکہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لئے، انفرادی تکمیل اور اجتماعی ترقی کی راہیں متعین کرنے اور ان پر گامزن ہونے کے لئے! منزل کے تعین اور اس کی طرف بڑھنے کی توانائی حاصل کرنے کے لئے! شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے، ہم کچھ سمجھتے جاتے ہیں کہ قومی زندگی کا وہ انفرادی انتشاری تصور ہم نہیں اپنا سکتے جو اس دور انحطاط میں ہم پر مسلّط ہو گیا تھا کہ اس سے تو وجود ملّت ہی مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ہم پھر اپنی ملّی ہستی کی خالص دینی اور اخلاقی اساس کو دیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ ہمیں اپنی ملّت کے انسانی اور عالمی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان پھر آنے لگا ہے۔ اور کانوں اور دلوں تک شہداء علی الناس کے مرتبے اور ذمہ داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں بار پانے لگی ہیں۔ ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھ اٹھانے لگے ہیں جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اسے با مقصد اور بامعنی بناتی اور کل زندگی، کل کائنات میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو نسل وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہے جو اک اُمّی نبیؐ نے دنیا کو سُنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملّتِ اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

(مقتبس)

***

یوم سرسید ۱۹۷۰ء کا خطبہ

علی گڑھ ماضی و حال

از پروفیسر رشید احمد صدیقی

علی گڑھ کے ماضی وحال کے بارے میں بات کی جائے تو اس کی ابتدا علی گڑھ کے اس مرد دانا کے تذکرے سے ہوگی جس کے یوم پیدائش کی تقریب کا آج انعقاد ہورہا ہے۔ سرسید کی پیدائش کو آج ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر مدت ہوئی اور ان کی وفات کو تقریباً بہتّر سال ہوئے۔ اس مدت میں قومی زندگی جن نشیب وفراز سے گزری، کیسے نشیب و کیسے فراز، ان کی نشاندہی کی کوشش کیجئے تو سید کی خدمات اور کارناموں کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے علی گڑھ اور ہندستان کی تاریخ کا ذکر ہو تو سرسید اور ان کے عہد کو بھلانا ممکن نہیں۔

یاس و ہراس کے اس دور کا اندازہ اور ان شخصیتوں کا تصور کرتا ہوں جنھوں نے اس عالم ابتلاء و آزمائش میں انسانیت، آزادی، انصاف، علم اور شائستگی کے چراغ جلائے تو سرسید کا وجود قومی افق پر امید، عزم اور یقین کے ایک روشن ستارے کی مانند نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں ہیں، کہ انھوں نے قومی زندگی کے شدید بحران کو جس شدت سے محسوس کیا اتنی ہی گہری دلسوزی، دیانت اور دلیری سے قومی تعمیر وترقی کی ایک عظیم الشان جمہوری تحریک کی قیادت کے فریضے کو انجام دینے کی ایسی شاندار روایت کا آغاز کیا جس کی مثال ان سے پہلے ہمارے ملک کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

قومی زندگی کے بے شمار شعبے ہیں مگر یہ امر تعجب سے خالی نہیں کہ ان میں سے تقریباً ہر اہم شعبہ ان کی گہری توجہ کا مرکز بنا۔

وہ زمانے اور سوسائٹی کی جانب ایجابی میلان رکھتے تھے۔ اور عملیت پسند انداز فکر کی حمایت کرتے تھے۔ وہ اس رمز سے خوب واقف تھے کہ ''قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ''۔

انھوں نے قوم کی تعلیم وتربیت میں بے غرض جماعتی کام کی اہمیت کو واضح کیا۔ وہ شاید ہمارے ملک میں پہلے شخص ہیں جس نے تہذیب وتمدن کی ترقی میں ایک حرکی نظام تعلیم کو کلیدی حیثیت دی اور علوم کی ترقی کو دوسری تمام سرگرمیوں پر ترجیح دی۔ اور اپنے تمام ہموطنوں کو دعوت دی کہ وہ اپنی جملہ تعمیری صلاحتیوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول پر مرکوز کردیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان خیالات کے دوسرے بڑے لوگ بھی ملک میں موجود تھے اور وہ اس طرح کی اصلاحات اپنے اپنے حلقوں میں عام کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن سرسید کا اصلاحی پروگرام ان سے زیادہ مشکل اور جامع تھا اور وہ اس کو وسیع تر پیمانے پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔ سرسید جن لوگوں میں بھیجے گئے تھے وہ اپنے ہمعصروں سے زیادہ آئینِ نو سے ڈرتے اور طرز کہن پر اڑتے تھے۔ اس لئے کہ، وہ حال ہی میں حکومت سے معزول ہوئے تھے، اس حکومت اور سوسائٹی سے جو عرصہ سے کھنگی اور بے عملی کے تصرف میں آچکی تھی۔ نظر برآں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ایک جامع تہذیبی وتعلیمی تحریک کی جیسی قیادت سرسید نے کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اتنے بڑے ملک میں اتنے برے دنوں میں ایسے بدحال اور کسمپرس لوگوں میں جتنے اچھے اور بڑے کام جن دشواریوں میں سرسید نے جس خوبی اور کامیابی سے انجام دئے وہ نہ صرف ان کا عظیم ذاتی کارنامہ ہے بلکہ ہماری تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ جو رول (Role) یورپ میں ازمنہ وسطی کی مجہول اور متعصب ذہنیت سے نجات دلانے میں ریفارمیشن اور رینا سنس کی عظیم شخصیتوں نے ادا کیا ویسا ہی ہماری تاریخ وتہذیب میں سرسید نے انجام دیا۔ کتنا صحیح ہے ان کی لوح تربت کا یہ کتبہ (شعر) کہ حضرت موسی اور کوہ طور ایک جلوے کی تاب نہ لاسکے، ایک میرا دل ہے جس نے اس طرح کے کتنے بے شمار جلوے دیکھے اور سہے ہیں! مبالغے میں بات کرنا بد مذاقی ہے لیکن جب کبھی سرسید کے مزار کی طرف سے گذرتا ہوں، سرسید کا یہ شعر ان کے مزار پر نظر سے ضرور گذر جاتا ہے ور یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے ایسا شعر کہا ہو اور اس کا مصداق بھی ہو!

•

چند اہم مسائل کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو سرسید کو درپیش تھے۔ اور جن سے اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی اندازہ ہوسکے گا کہ سرسید نے ہماری زندگی میں پیوست ان منفی اور مثبت عناصر کو سمجھنے اور قابو میں لانے میں کتنی اور کیسی کوشش کی جن کے عمل اور ردعمل کے نتائج سے ہم ایک طور پر مستقلاً متاثر ہوئے ہیں، اور کچھ تعجب نہیں اگر ایک نامعلوم مدت تک متاثر ہوتے رہیں۔ وہ مسائل کیا ہیں؟ میرے نزدیک، یہ ہیں ہندستانی انسانیت کا اتحاد، ہندی مسلمانوں کا تہذیبی وتعلیمی خود ارادیت کا حق، اور مذہب اور سائنس کے حدود اور حقوق کو سمجھنا۔ بالفاظ دیگر ایک منصفانہ، ترقی پذیر، روشن خیال باعزت اور امن پسند معاشرہ کا قیام واستحکام۔ آیئے دیکھیں کہ ان مسائل کے افہام وتفہیم میں ہمیں سرسید سے کیسی کتنی اور کہاں کہاں روشنی ملتی ہے۔ ایسا کرتے وقت تھوڑی دیر کے لئے ہم کو بھول جانا چاہیے، کہ سرسید کی سواری گھوڑا گاڑی تھی اور آپ کی جمبو جٹ؛ یا سرسید اپنا سارا کام اور حساب وکتاب محض اپنے دو ہاتھوں سے انجام دیتے تھے اور آپ کے لئے بجلی کے ٹائپ رائٹر اور کمپیوٹر موجود ہیں؛ یا یہ کہ سرسید نے صرف سات سمندر پار کئے اور آپ خلائی فضا پار کرکے چاند پر جا پہنچے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ چاند سے تو صحیح سلامت زمین پر واپس آگئے لیکن خود زمین کو صحیح سلامت نہیں پاتے۔ سرسید چاند پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن انھوں نے جس زمین میں بیج بکھیرے ان میں آج بھی پھول کھلتے رہتے ہیں اور بہار آتی ہے۔

سرسید کے زمانے میں بدیسی استعمار کی گرفت میں ہندوستانی انسانیت کا اتحاد کمزور سے کمزور تر ہوتا جارہا تھا، اور ہمارا ملک سیاسی آویزش کے نامبارک دور میں داخل ہونے لگا تھا۔ اس دور کی سیاسی صورت حال کو سامنے رکھیں تو ہندستان ایک سہ طاقتی کشاکش وکشمکش سے دوچار نظر آتا ہے۔ ان طاقتوں کی نمائندگی انگریز، ہندو اور مسلمان کرتے تھے۔ ان میں واضح طور پر سب سے کمزور اور درماندہ مسلمان تھے۔ اس سہ طاقتی مقابلے میں سب سے کمزور طاقت کا کیا انجام ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے جب یہ معلوم ہو کہ اکثریت/ اقلیت کے اخلاقی وتہذیبی توازن کو اہمیت دینے کے بجائے عددی تناسب پر زور دئے جانے کا امکان بڑھ رہا تھا۔ اس صورت میں اقلیت ایسے حال کو پہنچ جاتی کہ اس کی تخلیقی اور ترقی پذیر صلاحیتیں یکسر مفقود نہیں تو معطل ہوجاتیں۔ اس پیچیدہ اور خطرناک پوزیشن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سرسید کو سامنے آنا پڑا۔ انھوں نے نہایت صفائی، ایمانداری اور دلیری سے اس امر کا اظہار کیا کہ وہ اس صورت حال کو پرخطر اور بے ثمر سمجھتے تھے اس لئے کہ وہ ایک شاندار اور قابل فخر ورثے کے امین تھے جس کے تحفظ اور ترقی کو وہ قومی اور ملکی ترقی اور ناموری کے لئے ضروری خیال کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان ہمیشہ سے مختلف اور متنوع تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اس بنا پر کسی ایک تہذیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسری تہذیبوں کی نفی کرے۔ وہ کسی ایسے سیاسی تصفیے کو تسلیم نہ کریں گے جس سے ان تہذیبوں کی بقا اور ترقی کو خطرہ ہو۔ انھوں نے ہندستانی انسانیت کے اتحاد کو تہذیب کا مسئلہ قرار دیا اور اس طور پر اس وقت کی سیاست کو تہذیب کا تابع کیا۔ انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں دونوں سے صلح اور دوستی کا رشتہ قائم کیا اور ہر سطح پر اس رشتے کو استوار کرنے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان کو اس مشن میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ سرسید نے انگریزوں اور جملہ ابنائے وطن کا جیسا سچا اور پکا اعتماد حاصل کیا اس کی بنا پر اس عہد میں ان کی قیادت کو کل ہند قیادت کا درجہ حاصل ہوا، جو ان سے پہلے کسی ہندستانی کے حصہ میں نہیں آیا تھا۔

سرسید حکومت اور ابنائے وطن کو اپنا ہم خیال بنانے میں جس قدر کامیاب ہوئے اسے میں ان کی شخصیت کا اعجاز سمجھتا ہوں۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحتیوں کو اپنی اکتسابی خوبیوں سے اس طور مربوط ومحکم کیا تھا کہ ان کی ذات میں مقناطیس اور پارس پتھر کی صفات پیدا ہوگئی تھیں۔ لوگوں کے دل ان کی طرف کھنچتے تھے اور جو چھو گیا وہ زرِ خالص بن گیا۔ ان صفات سے خود انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے کو کلیۃً ملک اور قوم کی خدمت کے

لئے وقف رکھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی وفات پر ان کا بنک بیلنس صفر تھا لیکن قوم کے خزانے میں اتنا اثاثہ ضرور [جمع کر دیا] تھا جو اس کے خوش آیند مستقبل کی ضمانت کے لئے کافی تھا۔ وہ لوگ جو آج قومی اتحاد و یگانگت کے اعلی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہیں وہ سر سید کے طرز فکر و عمل سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

● سر سید کے سامنے دوسرا بڑا مسئلہ، ہندی مسلمانوں کی تہذیبی و تعلیمی خود ارادیت کے حق کو ملک کی عام تہذیب اور اس کے تعلیمی نظام میں متیقن و مستحکم کرنے کا تھا۔ ان کے نزدیک ہندستان کی ''دامانِ باغبان و کف گلفروش'' تہذیب کی نمو اور نمود اس پر منحصر تھی کہ اس کی تہذیبی اقلیتیں آزادی اور انصاف کی فضا میں سانس لینے پر قدرت رکھتی ہوں تا کہ وہ نہ صرف اپنی تہذیب کے قیمتی عناصر کا تحفظ کر سکیں بلکہ اپنی اعلیٰ تعمیری سرگرمیوں سے قومی تمدن کی سیرابی میں مسلسل مدد دے سکیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک کسی تہذیب کا بجائے خود منفرد ہونا یا کسی کا اس سے منسلک ہونا نہ اس تہذیب کی خامی تھی نہ اس شخص کا گناہ۔ جب تک کسی تہذیب کے اقدار ایک اعلیٰ معاشرے اور اعلیٰ انسانی تخلیق و تعمیر سے عبارت ہیں، انسانیت کے لئے اس تہذیب کی قدر و قیمت مسلّم ہے۔ حقیقی تہذیب کا مقصود و منتہا اچھے اور بڑے انسان کو ظہور میں لانا ہے۔ اس نقطہ نظر سے سر سید کی تہذیبی و تعلیمی تحریک، ہندستانی زندگی کے ایک اہم تہذیبی عنصر، ہندی مسلمانوں کی بقا و بالیدگی کے لئے تہذیب و دانش کے اعلیٰ اور مسلمہ معیاروں کے مطابق تھی۔ اس لئے میرے نزدیک اس بارے میں ان کی خدمات ان تمام لوگوں کے لئے قابل توجہ و تکریم ہیں جو ایسے کام کی قدر کرنے کو ایک اعلیٰ انسانی فریضہ سمجھتے ہیں۔

●

سر سید اور ان کے رفقا کے افکار و اعمال نے جو پیرایہ اختیار کیا وہ عام طور سے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے موسوم ہے۔ اس کا مرکز ایم، اے، او کالج کی شکل میں قائم ہوا جس نے بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ ہماری قومی تعلیمی تحریک نے اسی سرزمین اور اس فضا میں پرورش پائی اور پروان چڑھتی رہی ہے۔ اس ادارے کے بانیوں نے اس کے جو مقاصد متعین کئے تھے، اس سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔ پھر بھی بعض ان باتوں کو دہرانے کو جی چاہتا ہے جن سے ہم کو غالبا آج کے حالات میں بھی اتنی مستند رہنمائی مل سکتی ہے جو کوشش کے باوجود اس وقت کہیں اور سے ملتی نظر نہیں آتی۔ سر سید نے کہا ''دوستو، ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی...... ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی''۔ ان الفاظ میں تعلیم کے مسئلہ پر حق خود ارادیت کی کتنی واضح اور پُر زور وکالت ملتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جن شرائط کے ساتھ یونیورسٹیاں قائم کی تھیں، سر سید کے نزدیک وہ قومی مزاج اور تہذیب کی فطری اور اعلیٰ نشو و نما کے لئے بڑی حد تک ناسازگار تھیں۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ حکومت کی سیاسی مصلحتوں کے پروردہ تعلیمی ادارے ان بنیادی قومی مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں جن کی تکمیل سے ملکی تہذیب کی فی الواقع توسیع و ترقی ہوتی ہے۔

ہر چند کہ یہ ادارہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب کی غرض سے کلیۃً مسلم انتظام کے تحت قائم ہوا لیکن ابتدا ہی سے اس کی پالیسی تمام ہموطنوں کے لئے خیر سگالی اور ہمدردی کی تھی۔ اس کی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو پورے مواقع اور سہولتیں حاصل رہیں۔ کالج کی طرف سے ایک ایڈریس میں جو وائسرائے گورنر جنرل ہند کو ۱۸ نومبر ۱۸۸۴ء کو دیا گیا اس پالیسی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''......کبھی یہ خیال نہیں کیا گیا تھا کہ ہندو یا عیسائی یا یہودی اس جگہ تعلیم نہ پاویں گے...... بانیوں نے ابتدا سے ارادہ کیا تھا کہ مثل قرطبہ اور غرناطہ کی مسلمان یونیورسٹیوں کے، سب قوم کے لوگوں کو بلا تعصب اس میں تعلیم دی جائے۔ چنانچہ موجودہ کالج میں ہندستانی، پارسی، سب تعلیم پاتے ہیں اور سب کو تعلیم کے باب میں برابر استحقاق دئے جاتے ہیں''۔

کالج کے بانیوں نے اپنے اس ارادے کی تعمیل جس خلوص اور ایمانداری سے کی اس کی تصدیق اس ادارے کے ریکارڈ سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے جو بحیثیت پریسیڈنٹ ایجوکیشن برائے ہند، ۸، اگست ۱۸۸۲ء کو کالج میں آئے تھے کہا:

''اس کے بانیوں نے جو ٹھیک ٹھیک ایک مسلمان مدرسہ ہے، اپنا دروازہ تمام اقوام اور مذاہب کے لڑکوں کے واسطے کھول دیا ہے۔ مجھکو معلوم ہوا ہے کہ منجملہ ۲۵۹ طالب علموں کے ۵۷ ہندو یا کل میں سے تقریبا ایک چہارم ہندو ہیں، عیسائیوں اور پارسیوں کے لڑکوں نے بھی اس کے اندر فیاضانہ تعلیم حاصل کی ہے''۔

کالج کے ابتدائی زمانہ کے ایک نامور طالب علم سید طفیل احمد منگلوری کا بیان ہے کہ:

''ہندو اور مسلمان طلباء اس زمانے میں یگانگت کے ساتھ کالج کے بورڈنگ ہاؤسوں میں رہتے اور ایک دوسرے کے رنج و راحت میں یکساں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک نمایاں بات یہ بھی ہوئی کہ علی گڑھ کالج سے سب سے اول ایک ہندو طالب علم بابو ایشری پرشاد نے بی اے کیا۔ انھیں ۱۸۸۲ء کے سالانہ جلسہ میں سر سید نے اپنے ہاتھ سے تمغہ پہنایا تھا۔ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی رواداری اور یگانگت کے اصول کو جس طرح عملی طور پر کالج نے اپنایا اور فروغ دیا اس کی مثال اس وقت کے کسی دوسرے ادارے میں مشکل سے ملے گی''۔

اس طور پر ایم، اے، او کالج میں مختلف عقائد رکھنے والے اساتذہ اور طلباء کی آزاد اور متفقہ کوششوں سے جو تہذیبی فضا قائم ہوئی اسے میں علی گڑھ تحریک کا بڑا دلکش اور قابل قدر کارنامہ قرار دیتا ہوں، جس نے ہندستان میں ایک ہم آہنگ تہذیبی زندگی کی روایات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اقلیت کی تہذیبی و تعلیمی خود ارادیت سے ملکی تہذیب کی سالمیت کو استحکام حاصل ہوتا ہے، اور اس کے باشندوں کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ میں بیش بہا مدد ملتی ہے۔ اس نکتہ کی عملی تفسیر علی گڑھ نے پیش کی۔ آپ کو یاد ہوگا آزادی کے بعد ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہمارے نامور ترین اولڈ بوائے اور ہندستان کے سابق صدر ذاکر صاحب مغفور نے راشٹرپتی، راجیندر پرشاد، کی یونیورسٹی کنووکیشن میں تشریف آوری کے موقع پر جب یہ کہا تھا کہ مستقبل میں ہماری آزاد جمہوری ریاست کی، انصاف اور مساوات کی بنیادوں پر جو تعمیر ہوگی وہ بڑی حد تک اس پر مبنی ہوگی کہ ہندستان، علیگڑھ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اور خود علی گڑھ ہندستان کو کیا پیش کرے گا۔ انھوں نے ہماری طرف سے ضمانت دی تھی کہ علی گڑھ ایک عظیم اور دلکش ہندستان کی تعمیر و ترقی میں ہمیشہ دل و جان سے شریک رہے گا۔ جدید ہندستان میں ذاکر صاحب کا یہ فرمانا سر سید اور علی گڑھ کے اس لازوال اساسی عقیدے کا ایک مستحکم اور معتبر اعلان تھا جس کا اعادہ ہم ہمیشہ ہر دور میں کرتے رہیں گے۔

●

اردو کو علی گڑھ سے جدا نہیں کر سکتے۔ دونوں کی سرحدیں نہیں قلمرو ایک ہے۔ دونوں کا مزاج و معیار یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی تاریخی اور سماجی تقاضے کی پیداوار ہیں۔ ہندستان میں اردو کا مسئلہ زبان ہی کا نہیں، تہذیب، معاشرت مساوات، علم لسان اور بول چال اور لین دین کی کل ہند زبان کا بھی مسئلہ ہے۔

سر سید کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب اور ملک کے بڑے کاموں میں حصہ لینے اور پانے کا مسئلہ تھا، اردو کو وسیلہ تعلیم بنانے کا مسئلہ تھا۔ اس بارے میں ایک قانونی نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت ایک کل ہند ادارے کی تھی۔ اس میں ایسے طلباء کو بھی داخلے کا حق تھا جو ملک کے دور افتادہ حصوں کے باشندے تھے اور ان کی زبان اردو نہ تھی لیکن وہ انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ اس بنا پر علی گڑھ کو ''اردو بردار'' رکھنے میں نہ صرف حکومت کی طرف سے اعتراض کا اندیشہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو کچھ کم نقصان نہ پہنچتا۔

● جدید اردو سے متعلق جب بھی اور جہاں بھی کوئی ذکر آئے گا۔ جون گلکرسٹ، فورٹ ولیم کالج، ماسٹر رام چندر، دہلی کالج اور شمس الامرا امیر فخر الدین (حیدر آباد) کے نام نامی ہمیشہ شکریہ کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ تفصیلات سے قطع نظر، ان اداروں کے پیچھے کوئی ایسا عزم و اعتقاد اور عظیم شخصیت نہ تھی جو کسی بڑے مقصد اور مشن کی تکمیل کے لئے قوت محرکہ کا کام دیتی ہے۔ یہ امتیاز نہایت واضح طور پر سر سید کے حصے میں آیا۔ اگر سر سید نے علی گڑھ تحریک کو اپنی اردو نثر سے اور اردو نثر کو علی گڑھ تحریک سے مقصد و محکمی نہ دی ہوتی تو جدید اردو کو وہ پر و بال نصیب نہ ہوتے جس کی بدولت وہ بہت جلد اعلی زبانوں کی صف میں داخل ہو گئی، یہ سر سید کی کھری اور کھڑی نثر تھی جس نے اردو کو ان مخصوص دبستانوں (مثلا دہلی، لکھنؤ وغیرہ) سے نکال کر عام کیا جن میں وہ اس طرح اسیر ہو گئی تھی جس طرح ملک کے باشندے ذات پات کے زندانوں میں مجبور و مقید تھے۔ سر سید کی دی ہوئی اردو کا منشور یہ تھا کہ اب سے اردو کا دبستان جغرافیائی حدود یا صنائع و بدائع کا مینا بازار نہیں بلکہ زندگی، زمانہ اور علم و ادب کے تقاضوں اور تکملوں کا کھلا ہوا بازارِ مصر ہوگا۔

سر سید نے علی گڑھ کالج میں اردو کو وسیلہ تعلیم نہیں بنایا لیکن انھوں نے تہذیب الاخلاق، سائنٹفک سوسائٹی اور اپنی تصانیف و تالیفات سے اردو کو جس طرح مالا مال کیا اور یہ پروگرام جس وسیع

پیمانے پر مقبول ہوا اس کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ سرسید ہی کے بنائے اور بتائے ہوئے خطوط پر ملک کے دور دراز گوشوں میں اردو تصنیف اور نشر و اشاعت کے علحدہ علحدہ ادارے کھلے اور کام ہونے لگا۔ صحافت، مذہب، اخلاق، اصلاح معاشرت، سیاست اور دوسرے علوم وفنون پر جس شوق اور کامیابی سے آج تک کام ہو رہا ہے ان سب کی منظم ابتدا سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ہوئی، وہ سواد اعظم جسے ہم علی گڑھ کہتے ہیں جو اپنوں کے لئے ایک عظیم ذمہ داری اور دوسروں کے لیے ایک دعوت اور بشارت ہے سرسید کا دیا ہوا ہے، صرف ایک شخص کا: ہیبت اور ہلاکت کے ایسے دور میں جو اس وقت تک مسلمانوں پر ہندستان میں کبھی نہیں گزرا تھا!

•

تیسرا بڑا مسئلہ جو سرسید کو درپیش تھا وہ مذہب اور سائنس میں ایک بامعنی رشتہ کی تلاش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں حالی نے جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہے، یعنی سرسید کو ''سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے''۔ اس وقت مذہب اور سائنس کا مسئلہ مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان تضاد وافتراق کی شکل میں رونما ہو رہا تھا۔ روح عصر سے واقفیت رکھنے میں سرسید اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے۔ انھوں نے مغربی تہذیب و دانش کے فعال مثبت اور مفید عناصر سے گہرا اثر قبول کیا تھا اور علوم اور سائنس کی ترقی کو اس دور کا سب سے اہم واقعہ قرار دیا تھا۔ بقول اقبال ''وہ دور جدید کے پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے آنے والے زمانے کے ایجابی مزاج کی ایک جھلک دیکھ لی تھی''۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب بین الاقوامی عناصر رکھتی ہے۔ اور ایک ترقی پذیر تحریک ہونے کی حیثیت سے عالمگیر ہونے کی وہی صلاحیت رکھتی ہے جو صدیوں پہلے اسلامی تہذیب کو حاصل تھی اور جس بنا پر اس تہذیب کا اثر واقتدار ایک وسیع رقبے پر پھیلا اور وہ متمدن دنیا کے لئے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ سرسید جانتے تھے کہ صلیبی جنگوں میں اسلام وعیسائیت کا ایک زبردست تصادم ہوا تھا اور اس معرکے میں اسلام کی فتح مسلمانوں کے مضبوط عقیدے، علوم وفنون میں ان کی دستگاہ اور مجموعی حیثیت سے یورپ سے زیادہ منظم تربیت یافتہ ور ترقی پذیر معاشرے کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس تصادم سے عرصے تک شکست وریخت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور عیسائیت کے اس تصادم نے مثبت حرکی تہذیبی عمل کو جنم دیا۔

مغرب میں سائنس کی ترقی سے جو ذہنی انقلاب آیا اور جس طرح علمی ترقی اور مادی کامرانی کے دروازے کھلے، سرسید نے ان کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ وہ اپنے ملک میں بھی ایک سائنسی ذہن پیدا کرنا چاہتے تھے، اسی لئے انھوں نے اپنی قوم میں جامد مذہبی خیالات وتوہمات کے خلاف بڑی صبر آزما جدوجہد کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سائنس کی ترقی مذہب کے منافی نہ تھی۔ اوہام پرستی اور قدامت پرستی کو مذہب کا دشمن بتایا اور سائنس کو اصلاً ایک ناطرفدار فریق قرار دیا جس کے امکانات لامحدود ہیں اور جو انسانی معاشرے کی مستقل اور مسلسل ترقی پر منتج ہوتا ہے۔ انھوں نے سائنس کی واضح حدود کی بھی نشاندہی کی جب انھوں نے کہا کہ سائنس کی دریافت کی ہوئی حقیقتیں اور انکشافات، مسلسل تحقیق وجستجو اور ان کے نتائج کی بنا پر صداقت کی لازمی مگر عارضی شکلیں متصور ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اور کائنات کی تفہیم وتسخیر کے لئے سائنسی طرز فکر وعمل ناگزیر ہے۔ مذہب کی بتائی ہوئی صداقت کا سرچشمہ وہ برتر و بلند ہستی ہے جو زمان ومکان میں جاری وساری بھی ہے، ان پر محیط ہے اور ان سے ماورا بھی ہے۔ ابدی صداقت سنت اللہ ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ اس لئے سائنس کی دی ہوئی جزوی اور عارضی صداقت اس کلی صداقت سے نہ متصادم ہے نہ اس کی نفی کرتی ہے، جسے مذہب پیش کرتا ہے۔ دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے دست و گریباں ہونے کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔

•

خود مذاہب عالم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے پیش نظر سرسید نے تقابلی مطالعہ کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کوشش کی اس سے ہم سب آشنا ہیں، ان امور کے پیش نظر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے جس کا اظہار حال ہی میں ایک دانشور دوست نے کیا ہے کہ اسلام کے بارے میں سرسید کا رویہ رومانی اور اعتذاری تھا۔ رومان اور اعتذار ایک حقیقت گریز مجہول اور منفعل ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ سرسید کا معمولی طالب علم بھی اس سے واقف ہوگا کہ ہماری قوم میں ان سے زیادہ حقیقت شناس، عملیت پسند اور مثبت انداز فکر ونظر رکھنے والا دوسرا شخص مشکل سے ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کام کی اہمیت آج اور بھی زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ مجوزہ سرسید اکیڈمی کے مقاصد متعین کرتے وقت ان دو باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ ایک یہ کہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کو اکیڈمی اپنے پروگرام میں جگہ دے دوسرے یہ کہ جدید علوم کو اردو میں اعلیٰ سطح پر منتقل کرنے کے لئے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا انتظام کرے۔

•

آج ایک بڑا سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہندستان کی آزاد سیکولر جمہوری ریاست میں اس ادارے کا مستقبل بحیثیت ایک مخصوص تہذیب یعنی ہندی مسلمانوں کی تہذیب کے نمائندہ تعلیمی ادارے کے، کیا ہوگا۔ میرا جواب یہ ہے کہ مبارک اور حوصلہ افزا ہوگا۔ اس طرح سوچنے کا سبب یہ ہے کہ مسلمان ہوں اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں، مسلمان ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ پر یقین رکھتا ہوں اور جمہوریت پر یقین رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت کی انسانیت پر بھروسہ کرتا ہوں۔ انسان کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اس کی تہذیب کو برومندی اور برگزیدگی اسی وقت نصیب ہوئی ہے جب وہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف مائل ہوا ہے۔

جب کبھی اور جس کسی نے اعلیٰ انسانی اقدار سے روگردانی کرکے دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے وہ بالآخر خود انھیں آفتوں کا شکار ہوا ہے جن کا ارتکاب اس نے دوسروں کے لئے روا رکھا تھا۔

ثبات ودوام صرف ایسی ریاست اور تہذیب کو حاصل ہوتا ہے جو فرد اور معاشرے کی بہترین صفات کو برسرکار لانے میں معین ہو اور تازہ کار رکھے۔ ہندستانی ریاست اخلاق اور تہذیب کے جن بلند آدرشوں پر قائم ہے وہ ہندستانی قوم کی اعلیٰ تمناؤں اور حوصلوں کی آئینہ داری کرتے ہیں اس لئے ہر ہندستانی کا یہ فرض ہے کہ ان عظیم مقاصد اور اہم مسائل کی ترقی اور تکمیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کردے۔ ہمارا آپ کا یا کسی اور کا وہ عمل جو ان عزائم کی نفی کرتا ہو، ریاست کی جڑیں کاٹتا ہے۔

ہمارا مقصد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم، تربیت اور تہذیب کا ایسا مناسب ومؤثر انتظام کرنا ہے جو ملک میں ایسے لائق اور حوصلہ مند نوجوان پیدا کرنے میں معین ہو جو اس کی ترقی اور ناموری کا باعث ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ اچھے مسلمان اور اچھے ہندستانی ہوں۔ یہ کام جتنا بڑا اور اچھا ہے اتنا ہی زیادہ مشکل، یعنی احساس ذمہ داری اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا ہے۔ اس کے لئے اس درس گاہ کے ارباب اختیار، اساتذہ، اولڈ بوائز اور طلباء کو بڑے انہماک واتحاد سے کام کرنا ہے۔ اس طرح وہ حکومت، ملک اور ساتھ رہنے بسنے والوں کا مکمل اعتبار اور تعاون حاصل کر سکیں گے۔ اس کامیابی کی شرط یہ ہے کہ ہم میں سے ہر فرد خلوص کے ساتھ اس کا تہیہ کرلے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو کام میں لائے گا۔ اپنے سے شاکی، دوسرے سے شاکی، زمین وآسمان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب سے شاکی: کرنا کچھ نہیں، کوسنا سب کو، کبھی گرجنا، اکثر گڑگڑانا، یہ سب چھوڑنا پڑے گا۔

ہندستان کے لئے ہندی مسلمانوں کی تہذیب، تمدن اور خیر سگالی کو جس حد تک علی گڑھ قابل قبول اور بابرکت بنانے میں کامیاب ہوگا وہ ایک نمونہ ہوگا باہر کے تمام مسلم ممالک اور مسلمانوں کے لئے اس بات کا کہ وہ دیگر اقوام عالم کے درمیان کس طرح ایک باعزت مقام حاصل کرکے عالمی انسانی برادری کی تعمیر میں مدد دے سکتے ہیں۔

•

چاہتا ہوں کہ آج آپ اپنے گھروں کو جائیں تو سرسید کی تقریر کے اس اقتباس کو اس شعر کے ساتھ ذہن میں گردش دیتے جائیں۔

''...... جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، ہم کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جاوے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے''۔

(سرسید میموریل لیکچر ۱۹۷۰ء۔ رشید صاحب کی تحریر سے مقتبس)

***

Aligarh Diaspora - 4

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

The best on the subject you have ever come across

A Muslim's Prayer

by Dr. Syed Vahiduddin

Allah, My Lord! Hidden and manifest, Creator Supreme and fashioner superb! Thine is the world I know and Thine the worlds I know not. Thy mercy envelops creation and Thy light dispels gloom. Burden me not with what I cannot bear and forgive me when I err. My life is a waste: let me not squander Thy bounty and lose hope in Thy loving beneficence. Unto Thee I flee and cry in anguish. Hold me close when my feet fail and lead me with the righteous to victory. Why should I grieve and fear when Thou art nigh and why should I complain against Thy decrees when I know not what Thou hast prepared for me? Ignorant as I am I know not the joy that may lie hidden in sorrow and the sorrow that may lurk in joy. 1 pray for those who have gone before me and beseech Thy forgiveness for my parents, in whose loving care I grew. Informed with wisdom let me grow in knowledge that comes of Thee. Suffer me not to envy the pleasures that others have and to languish in grief at the loss of what I have. Guard me against pride and lust and make me not vain and hypocrite. Let not passion make me wild and let not power blind me to the transient state of all that life offers. Blessed is he who has surrendered his all unto Thee and who has won his peace in Thy pleasure. May my tears in constant remembrance of Thee sustain the heart and bring deliverance! Bless me with the fullness of life on earth and when the time comes make me return unto Thee united in the fellowship of Thy loving ones. - Lord! Grant me above all, I pray, the vision of Thy countenance that Thou hast promised for those who arc Thine.

***

Reader's Cornor

From: Alig Brotherhood
علیگ عزیزوں کے خط

اس صفحہ پرآپ علیگ عزیزوں کے خط پڑھیں گے۔ کچھ ایسے مکتوب نگار بھی اس میں شامل ہیں، جن کے محترم والدین، اہلیہ، یا دوسرے blood relations علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں۔ مثلاً سید ین صاحب، شاہ حسن عطا صاحب، سلمیٰ عمرو غیرہ۔

●

علی گرڑھ ڈائسپورہ ایک اچھی پہل ہے جس کے لئے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں. شمارہ ۲ میں منیر فرشوری صاحب کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی. وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں اور اپنی ذات میں ایک انجمن. امید کرتا ہوں کہ آیندہ کسی شمارے میں ان پر ایک تفصیلی مضمون بھی آئے گا.

- شاہین نظر

●

A pleasure to receive the Aligarh Diaspora. Is this published in a newspaper or something else?

I am deeply connected to the Aligarh Movement and exploring it in all possible ways!

Introducing My Book : Discovering AMU (1st Book On AMU To Capture Its Entire Essence In A Unique Manner)

2 Volumes in 584, A4 Coloured Pages, with more than 100 Chapters. Kindle Edition is not planned due to Coffee Table Style

- Atif Hanif

●

اس کے پہلے شمارے میں خسرو صاحب پر پروفیسر اقبال صاحب کا نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی مضمون پڑھا، پروفیسر عزیزالدین حسین ہمدانی صاحب کو بھی پڑھنے کے لئے بھیجا، اس شمارے کو بھی پڑھوں گا۔

-شہزاد انجم، جامعہ، دھلی

●

About Aligarh Muslim University Aligarh, please note and display/post.

First Founding Chancellor of Aligarh Muslim University was

Her Excellency Sultan Jehan Begum (sarkAr ammaN),

Ruler of Bhopal from 1920 to May 1930.

- ALAY AHMAD

●

Good to see the "Darbar Syed-e-Azam" with reference to Lisan us-Sidq.

In 2017, Aligarh Alumni Association Washington DC celebrated "Sir Syed Bi-Centenary". Yours truly was its Coordinator.

As part of the event, we organized a Seminar, a short play on the life of Sir Syed, Daastaan, and a Books – and – posters exhibition. I prepared a poster of "Darbar - e - Syed".

I am attaching it for your reference.

- Afzal Uslami

●

Received your message through AMU network. I was there in Aftab Hall and Mumtaz in room no. 42, later 32, thereafter shifted to Aftab Hostel for a short period of time, thereafter new vice chancellor came disturbed the University for long.

- Javed Raza

●

Is inayat ke liye Shukria, umeed hay ba-khariat hongey.

- Iftikhar Alam

●

Thanks for starting bringing back Old Memories which are not a source of eneergy to us and coming generation.

- Aftab Khan, Riyadh
Mumtaz Hostel; 1963-70

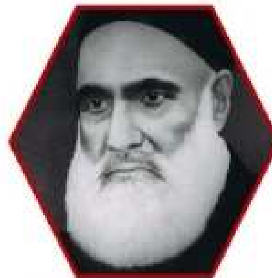
***

Good to see the "Darbar Syed-e-Azam" with reference to Lisan us-Sidq. In 2017, Aligarh Alumni Association Washington DC celebrated "Sir Syed Bi-Centenary". Yours truly was its Coordinator. As part of the event, we organized a Seminar, a short play on the life of Sir Syed, "Daastaan", and a Books–and–posters Exhibition, I prepared a poster of "Darbar - e - Syed". I am attaching it for your reference. ***– Afzal Uslami***

Darbar - e - Sir Syed*



Mohsinul Mulk
1837-1907



Viqarul Mulk
1841-1917



Shibli Nomani
1857-1914



Nazir Ahmad
1831-1912



Altaf Hussain Hali
1837-1914





Maulvi Samiullah
1834-1908



Maulvi Zakaullah
1832-1901



Haji Ismail Khan
1853-1922



Maulvi Chiragh Ali
1844-1895

*Maulana Abul Kalam Azad : May, 1905 – Lisan us Sidq (Newspaper)